عالیہ نکہت

ریسرچ اسکالر، بہاءالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر قاضی عابد

پروفیسر، بہاءالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان

مغرب اردو سفر نامے میں

ABSTRACT

Reflection of West in Urdu travelogues.

By Aalia Nikhat, Research Scholar, Department of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan

Dr. Qazi Abid, Professor, Dept. of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan

This article concerns about the reflection of west, its cultural norms seen by the writers of the travelogues who traveled western countries from 19th century till the last century. These are famous and the important Urdu writers who traveled for different purposes. They have depicted the soul of the western culture in their travelogues. This article analyses these writings.

سفر نامہ کسی سفر کی روداد ہوتی ہے۔ انسان کی تنوع پسند طبیعت نے ہمیشہ انسان کو آمادہ سفر رکھا ہے۔ طویل عرصہ تک ایک جگہ قیام انسان کی طبیعت پر بے چینی اور اکتاہٹ پیدا کرتا ہے۔ یہی اکتاہٹ اسے سفر اور نقل مکانی پر اکساتی ہے۔ سفر نامہ کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ اجنبی معاشرت، فضا اور مناظر سفر نامہ نگار کی فکر کو نئی اساس مہیا کرتے ہیں۔ سفر کرنے سے تجربات کو وسعت ملتی ہے اور روشن خیالی پیدا ہوتی ہے۔ تہذیب یافتہ اقوام کی ترقی کی بڑی وجہ سفر بنے۔ دوسری تہذیبوں کو کھوجنا، ان سے استفادہ کرنا اور ان کی قومی و انفرادی ترقی کا جائزہ لینا سفر کرنے والوں کے ملک کی تہذیبی و مادی ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ تحیر اور تجسس سفر نامے کو دلچسپ بناتے ہیں۔ فضا اور ماحول سے اجنبیت تحیر خیزی اور تجسس پیدا کرتے ہیں۔ سفر نامہ کئی اقسام کا ہوتا ہے جیسے ادبی، تعلیمی، کاروباری، سیاسی، تجارتی، جنگی، مہماتی، شاہی اور خیالی یا تصوراتی وغیرہ۔ سفر نامہ نگار کے گرد بکھرے مناظر، واقعات اور اس کے ایسے احساسات اور رائے سفر نامہ کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ بیانیہ صنفِ

ادب ہے۔ سفر نامہ کسی خاص تکنیک کا پابند نہیں ہوتا کبھی یہ ڈائری اور روز نامچے کی صورت میں لکھا جاتا ہے تو کبھی خط کی تکنیک میں۔ سفر نامہ نگار کا مشاہدہ اور یادداشت سفر نامے کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں۔

''سیاحت کے ثمرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں۔ اس لیے سفر ناموں کا بیان بھی منہ بسورنے اور آہ وزاری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تخلیقی سفر ناموں کی شگفتہ بیانی راضی پر رضا ہونے کی علامت ہے فطری سیاح اپنے منتخب کردہ پر صعوبت سفر کے حال پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے۔ سو طے پایا کہ اس کے لیے شگفتہ اور سبک اندازِ تحریر مناسب ہے لیکن نہ اتنا کہ پھکڑ بازی کی حدود کو چھونے لگے۔''(۱)

کسی علاقے یا خطے کی مربوط تاریخ پیش کرنا سفر نامہ نگار کی ذمہ داری نہیں مگر سفر نامہ تحریر کرتے ہوئے اگر سفر نامہ نگار چاہے تو سلیقے سے اس علاقے کے عصری حالات اور تاریخ بھی بیان کرسکتا ہے۔

اٹھارویں صدی تک اردو ادب کا دامن سفر نامے سے خالی نظر آتا ہے اگرچہ مغلوں نے اپنی 'تزک' میں کچھ اسفار کا احوال بتایا ہے مگر وہ باقاعدہ سفر نامے نہیں تھے۔ مشرق میں بسنے والوں کو اپنے جغرافیائی تحفظات اور حد بندیوں کی وجہ سے ہندوستان سے باہر نکلنے کے مواقع کم ملے۔ اردو سفر ناموں کے ابتدائی نقوش داستانوں میں ملتے ہیں۔ میر امن کی باغ و بہار میں چار درویشوں کے سفر کا قصہ، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل میں حاتم طائی کی سات سیاحتیں، خلیل خان اشک کی داستانِ امیر حمزہ، کی محیر العقول سفری داستان، یہ کتابیں اور قصے خیالی تھے مگر اردو ادب میں سفر نگاری کا آغاز قرار پاتے ہیں۔

اردو زبان میں یوسف کمبل پوش کے ''عجائباتِ فرنگ'' کو اولین سفر نامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یوسف کمبل پوش نے یہ سفر ۱۸۳۷ء میں انگلستان کی جانب کیا۔ اس سفر نامے کی خاص خوبی اس کی سادگی، تحیر اور وارفتگی ہے۔ اسے پہلی بار پنڈت دھرم نرائن نے دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم سے ۱۸۴۷ء میں شائع کیا۔ ۱۹۸۳ء میں تحسین فراقی نے اسے از سر نو ترتیب دے کر ایک پُر مغز مقدمے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا۔ کمبل پوش ۱۳ اگست ۱۸۷۳ء میں جہاز سے اُتر کر کشتی کے ذریعے لندن روانہ ہوئے وہ لندن کو دیکھ کر وارفتہ و حیران رہ گئے۔ ان کے سفر نامے میں جاذب نظر نظارے، تحیر انگیز واقعات، نئے تجربات اور ایک دیہاتی کی سی حیرت پائی جاتی ہے جو اچانک کسی بڑے شہر میں آ نکلے۔ یوسف کمبل پوش انگلستان سے بہت متاثر نظر آتے ہیں کہیں کہیں وہ احساسِ کمتری کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ انگلستان کی تہذیب، معاشرت، تمدن، ثقافت اور اس کی اقتصادی زندگی کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

مغربی عورت کا حسن انھیں متاثر کرتا ہے۔

''تا گاہ ایک معشوقہ چودہ برس کی دیکھی۔ ایک دکان پر بیٹھی پری صورت، حور سیرت،

چاند اس کو دیکھ کر شرمائے، سورج اس کے فراق میں دن بھر چکر کھائے۔ عجب حسن و جمال بے مثال کہ یہاں اس کا جمال، گورے گورے گال، ہونٹ لال، دانتوں میں چمک، کمر میں لچک، شیریں ادا، دلربا، بھری اس کی چھاتیاں، عاشقوں کو پھسلاتیں۔''(۲)

[] یک بارگی ایک رنڈی پری زاد نکلی۔ اس کو دیکھنے سے میری آنکھوں میں ٹھنڈک آئی، عجب صورت رکھتی تھی کہ چاند کو شرماتی، پردے نکل کر اُوس پر منبر پر آ بیٹھی۔(۳)

لندن کی معاشرت کو تہذیب یافتہ اور باسیوں کو خوش سلیقہ اور محنتی بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ لڑکے پری زاد جا بہ جا جمع ہو کر عقلمندوں کی طرح بیٹھے باتیں کرتے، لڑکپن میں دانائی حاصل کی کہ ہندوستان کے بڈھوں کو بھی نہیں ہوتی۔ فضا فرحت بخش، کنواریاں خوش جمال، گانو آباد، کھیت غلوں اور میووں کے بھرے ہوئے۔ کیمپ کینڈی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عجب شہر ہے لڑکوں، کنواروں، خوبصورتوں کو دیکھا کہ اوستاد کے سامنے امتیاز سے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ خورد بزرگ سے حسب مراتب ادب سے پیش آتے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ ہمارے وطن کے لڑکے اس سن میں نشست و برخاست کی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ کیا شے ہیں کہ اس صغر سن کے باوجود حسن و جمال کے دانائی میں بڈھوں سے سبقت لے گئے ہیں۔(۴)

کمبل پوش آزاد مرد ہے اسی آزاد روی نے اسے کسی مروجہ مذہب سے زیادہ قریب نہیں کیا۔ اس نے مغرب کو ایک آوارہ منش انسان کی نظر سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں مغرب میں لوگ ظلم، وعدہ خلافی اور نا انصافی کو پسند نہیں کرتے۔ مغرب کی دل آویزیاں، رنگینیاں، خوبصورتیاں اور نسوانی حسن و جمال اسے دیوانہ بناتی ہیں۔ سفر نامہ نگار انگریز کی علم دوستی، مستقبل شناسی اور اعتماد کو سراہتا ہے۔ یوسف کمبل پوش کے سفر نامہ میں مغرب کو کیونکہ مذہب کے ساتھ ملا کر نہیں دیکھا گیا اس لیے مغرب پر تنقید کم ملتی ہے اور ایک روشن خیال، پر اعتماد، علم دوست، انصاف پسند، خوبصورت اور قانون پسند خطے کی تصویر سامنے آتی ہے۔

۱۸۶۹ء میں مغرب کی جانب ایک اہم سفر سر سید احمد خان کا تھا۔ یہ سفر علمی نوعیت کا تھا۔ وہ مغرب کے تعلیمی نظام اور نصاب کا جائزہ لے کر اسے ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے اس لیے اسے تعلیمی و تحقیقی سفر نامہ کہا جا سکتا ہے۔ ''مسافرانِ لندن'' کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یورپ کا جو پہلا شہر سر سید احمد خان نے دیکھا وہ فرانس کا شہر مارسلیز تھا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ایسی وسیع اور صاف اور خوبصورت اور ایسی ایسی عمدہ آراستہ دوکانیں دیکھنے میں

آئیں کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ بازار میں مٹی یا تنکے یا کوڑے کا نام تک نہیں تھا۔ تمام عمارات صاف اور اجلی زن و مرد نہایت صاف اور وضع دار اور ہر طرح کی خوبصورتی میں آراستہ نظر آئے۔''(۵)

سرسید احمد اس سفر نامے میں بار بار مشرق و مغرب کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ مغرب کو دیکھ کر مبہوت نظر آتے ہیں۔ پیرس اور لندن کے محلات، بازاروں، فواروں، میناروں، گرجا گھروں، عجائب گھروں اور پلوں کو نہایت خوشنما اور خوبصورت اور ہندوستانیوں کو خود غرض، نفس پرست، حسد اور تعصب کا شکار بتاتے ہیں۔ انھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا۔ معاشرے کے سب طبقات میں گھلے ملے۔ ان کی مذہبی عبادات کی خوش سلیقگی سے ادائیگی کے بارے میں لکھا۔ وہاں کی عورت کو تہذیب یافتہ اور پُر اعتماد پایا۔ مغرب کی سائنسی اور علمی ترقی کو دیکھ کر لکھتے ہیں۔

''یہاں کے کاریگروں اور قلیوں کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے عالیشان مکانات اور میوزیم بھی دیکھے۔ انجینئروں کے کارخانے اور جہاز بننے کارخانے، توپوں کے بننے کا کارخانہ، تارِ برقی بننے کا کارخانہ، جو سمندر میں ڈالا جاتا ہے اور دنیا کو دوسری دنیا سے ملا دیتا ہے۔ جنگی جہاز اور گریٹ ایسٹرن کو بھی دیکھا۔ بعض سوسائٹیوں کی میٹنگ میں شریک ہوا اور ان سب جگہوں اور جلسوں اور کھانوں میں بھی شریک ہوا۔''(۶)

سفر کے دوران مختلف تعلیمی اداروں میں بھی گئے اور کلبوں، سوسائٹیوں، لڑکیوں کے اسکول اور لیکچروں میں بھی، مسافرانِ لندن، میں سرسید احمد خان مغرب سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اگر انگریز ہمیں یعنی ہندوستان میں رہنے والوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں ٹھیک سمجھتے ہیں تو ہم اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ یہ سفر نامہ آسان و سادہ زبان میں لکھا گیا ہے ان کی طرز تحریر پر ان کے مقصد نے بڑا اثر ڈالا ہے اس لیے وہ کئی جگہ واعظ و خطیب بنتے نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خان نے اپنے سفر نامہ میں مغرب کی مثبت تصویر کشی کی ہے۔ شاید ضرورت سے زیادہ مثبت۔

ابن انشاء کالم نویس، شاعر اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا سفر نامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' پیرس، لندن، جرمنی، ہالینڈ، سوئیٹزر لینڈ، ویانا اور لبنان کے اسفار کی کتھا ہے۔ ابن انشاء کیونکہ مزاح کے حوالے سے منفرد حیثیت رکھتے تھے اس لیے ان کے سفر نامے بھی اسی اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ مشرق و مغرب کا تقابل بھی ہلکے پھلکے انداز میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے مغرب کو مغرب کی گلیوں، عجائب خانوں، تاریخی مقامات، گیلریوں، بازاروں، عمارتوں، سائنسی ترقی، سڑکوں اور تاریخ کے تناظر میں دیکھا ہے۔ انھوں نے ہلکے پھلکے انداز میں مغرب کی کچھ برائیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً انگریزوں کے تعصب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''آپ نے لندن میں ایشیائیوں سے نسلی امتیاز برتے جانے کی داستانیں سنی ہوں گی

اور خبریں دیکھی ہوں گی لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ مسز واٹسن نے میری خاطر اپنی ایک ہم وطن کو چلتا کیا۔ ہاں آٹھ پونڈ کی بات البتہ ہے رنگ و نسل اپنی جگہ، پیسہ اپنی جگہ۔''(۷)

اس سفر نامے میں مغربی ممالک کے مناظر، معاشرت، تہذیب، تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کا موازنہ دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے پیرس، لندن، جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کی معاشرت پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ خصوصاً ایمسٹرڈم کے نہری نظام، سوئٹزرلینڈ کی وادیوں، لندن کے کلیساؤں اور میوزیم اور پیرس کے شانزے لیزے کی خوب تصویر کشی کی ہے۔ ابن انشاء کے سفر ناموں میں مغرب کے بارے میں مثبت رائے دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ مغرب کی تہذیب و تمدن یا معاشرت پر اعتراض نہیں کرتے۔

اختر ریاض الدین سفر نامے کا ایک ایسا نام ہے جن کے بغیر جدید سفر نامے پر گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی۔ سفر نامہ ''دھنک پر قدم'' پر انھیں آدم جی ادبی انعام بھی ملا۔ اس سفر نامے میں پڑھنے والوں کو ہوائی، لندن، میکسیکو، سان فرانسسکو، نیو یارک اور ہانگ کانگ کا احوال ملتا ہے۔ سفر نامہ نگار نے ہوائی کے جغرافیہ، موسیقی، قومی لباس دستکاریوں، خوشنما نہروں اور مذہب کے لحاظ سے جائزہ لیا ہے۔ لندن کی نائٹ لائف، تھیٹر، جوئے جانے، کلاسیکس، شکاری کتوں اور گھوڑوں کی ریس، باغات، پودوں کی لاکھوں اقسام، جھیلوں اور فطرت کی خوبصورتی کا ذکر ہے۔ میکسیکو کی معاشیات کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''اقتصادیات میں کیپٹل ازم غالب ہے۔ Free Enterprise کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ سوشلزم کو صرف یہاں تک اجازت ہے کہ تیل تو میا یا گیا ہے۔ بجلی، ٹیلیفون اور ریلوے بھی حکومت کے پاس ہے، ٹیکس بھی بہت ہلکے ہیں صرف ۴۵ فیصد امیروں پر امریکنوں کو ۴۹ فیصد سرمایہ لگانے اور ۱۵ فیصد اپنا سٹاف رکھنے کی اجازت ہے۔''(۸)

سان فرانسسکو کو شہر نہیں بلکہ شخصیت قرار دیتی ہیں۔ جس کے جغرافیہ، معاشرے، شہری خدوخال اور باشندوں میں تنوع نظر آتا ہے۔ سان فرانسسکو اور نیو یارک کی ثقافت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ نیو یارک کی تیز اور تجارتی زندگی بھی ان کا موضوع بنی۔ سفر نامہ نگار خود لکھتی ہیں کہ وہ مذہبی خاتون نہیں اس لیے وہ دنیا کو مذہب کی عینک سے نہیں دیکھتیں اور نہ ہی یہ سوچ کر پریشان ہوتی ہیں کہ دنیا ان کے بارے میں کیا سوچے گی۔ وہ مغرب کی پر اعتماد عورت کو پسند کرتی ہیں۔ امریکی عورت کے بارے میں لکھتی ہیں:

''امریکی عورت کا دنیا میں جواب نہیں نسلی اختلاط کے خمیر سے اٹھی ہوئی یہ عورت بہت حسین ہے۔ صحت مند ہے اور ہر فن مولا ہے۔ اس کے گوناگوں مشاغل نے اسے اتنا دلچسپ اور بذلہ سنج ساتھی بنا دیا ہے کہ مرد اس کی محبت میں بہت محفوظ ہوتے

ہیں۔''(۹)

مغرب و مشرق کا تقابل کرتے ہوئے وہ مشرق کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی منافقت پر طنز کرتی ہیں مگر ان کا رویہ متوازن ہے ان کے طنز و استہزا میں شائستگی اور مزاح موجود ہے۔ فکشن کے انداز میں لکھے گئے اس سفر نامے سے مغرب کی مثبت تصویر بنتی نظر آتی ہے۔

قر ۂ العین حیدر کا سفر نامہ ''جہانِ دیگر'' امریکہ کے سفری احوال پر مشتمل ہے۔ اس سفر نامے میں مختلف کرداروں کی خاکہ نویسی بھی ملتی ہے۔ وہ جگہ جگہ مشرق و مغرب کا تقابل کرتی نظر آتی ہیں مگر مغرب سے متاثر نظر نہیں آتیں۔ انھیں مخلوط رہن سہن اور مغربی خاندانی نظام پسند نہیں۔ انھوں نے امریکہ کو اس کی تاریخ سے ملا کر دیکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مشرقی تہذیب، مغربی تہذیب میں منتقل ہونا چاہتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ مشرق مغرب کی سائنسی ترقی سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے اور اسے بُرا بھلا بھی کہتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''پچھلے ڈیڑھ سو برس سے سارا مشرق مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اب اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جو لطیفہ تھا کہ مہاتما گاندھی مائیکروفون پر قدیم ہندی رام راج اور گاؤں کی غیر مشینی تمدن کا راگ الاپتے تھے۔ ملا خمینی ٹیلی ویژن پر ساتویں صدی کا پرچار کر رہے ہیں۔ جہد للبقا میں یہ لوگ ہم سے سبقت لے گئے۔ ہم لوگ جذبہ تجسس کھو چکے تھے۔ یہ لوگ نشا ۂ الثانیہ سے لے کر آج تک متحیر ہیں۔''(۱۰)

اس سفر نامے میں زیادہ تر ادبی تقریبات کی روداد ملتی ہے۔ انھوں نے عورتوں کے حقوق اور مسائل پر لیکچر بھی دیے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ امریکی سخت متعصب ہیں خاص طور پر مسلمانوں کے بارے میں۔ انھیں خود بھی اس متعصب رویے کا سامنا کرنا پڑا۔

> ''آج مجھے کالج میں لڑکوں نے ایرانی ایرانی پکار کر بہت تنگ کیا۔ میں نے کہا میں پاکستانی ہوں۔ وہ بولے پھر بھی تم مسلمان تو ہو سب مسلمان ظالم ہوتے ہیں۔''(۱۱)

سفر نامہ نگار کبھی کبھی فلیش بیک کی تکنیک بھی استعمال کرتی ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی تہذیبی، تاریخی، سماجی، معاشرتی اور معاشی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ سفر نامہ آپ بیتی کے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ قر ۂ العین حیدر کہیں بھی مشرق کو مغرب سے کمتر ثابت نہیں کرتیں وہ متوازن انداز میں مغرب اور مشرق کا تقابل کرتی ہیں اور کسی ایک تہذیب کو دوسری پر فوقیت نہیں دیتیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے سفر ناموں کو ایک الگ انداز دیا۔ انھوں نے ناول نما سفر نامے اور سفر ناموں نما ناول لکھے۔ ان کے سفر نامے کسی مقصد سے بندھے ہوئے نہیں ان کا مشاہدہ تیز ہے وہ آوارہ گرد کی طرح سفر کرتے ہیں اور جزئیات پر نظر

رکھتے ہیں۔ ان کے سفر نامے قدیم و جدید سفر ناموں کا سنگم ہیں۔ ''اندلس میں اجنبی'' ہسپانیہ کے عروج و زوال کی کہانی پر مبنی سفر نامہ ہے۔ انھوں نے ہسپانیہ کی تاریخ کو سامنے رکھ کر سفر نامہ لکھا ہے۔ ہسپانیہ کا اہم شہر میڈرڈ سفر نامہ نگار کو نہیں بھایا۔ ہسپانیہ کے مشہور اور قومی کھانے کے بارے میں بھی لکھا ہے ان کی شادی کی رسموں اور عمارات پر بھی۔ جدید قرطبہ میں کھڑے ہو کر وہ قرطبہ کی تاریخ کو یاد کرتے ہیں۔

> ''میں قرطبہ کے مرکزی چوک پلازا دے خوسے انتونیو کے دائیں کونے میں ایک بلند محرابی دروازے آرکوویل پورتلو کے تلے ایک ایسی بے نام سرحد پر کھڑا تھا جہاں میرے پیچھے جدید عمارتوں، بھڑکیلے نیون سائنوں اور کشادہ شاہراوں کا ایک ایسا پُر ہجوم شہر آباد تھا جس سے میری شناسائی نہ تھی اور میرے سامنے ایک تنگ پتھریلی گلی، ماضی کی عظمتوں میں خوابیدہ ایک ایسے شہر میں اترتی تھی جو میرے لیے ان دیکھا ہونے کے باوجود جانا پہچانا تھا..... میں نے سر جھکا کے پہلا قدم اٹھایا اور ٹائم مشین میں بیٹھے کسی ذی روح کی مانند صدیوں کے فاصلے کو آنکھ جھپکتے میں طے کر لیا میں ماضی میں تھا۔''(۱۲)

سفر کے دوران سفر نامہ نگار قدیم ہسپانیہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ دیکھتے ہیں۔ انھیں ہسپانیہ کی گلیوں میں ابن رشد، صلاح الدین ایوبی، مشہور رومی ڈرامہ نگار سینکا چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کے بارے میں تفصیل ملتی ہے۔ الحمرا کا حسن سفر نامہ نگار کو مبہوت کر دیتا ہے۔

''الحمرا نہ صرف صوری حسن میں یکتا ہے بلکہ اس کا فن تعمیر آج بھی اہل مغرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ پچھلے سات سو برس سے اتنی بڑی عمارت نا قابل یقین حد تک پتلے ستونوں پر کیسے قائم ہے۔ دراصل اندلس کے معماروں نے تعمیر الحمرا کے لیے متساوی الاضلاع تکون کو بنیاد بنایا جس میں قاعدے کے مطابق کشش ثقل کی لہریں ایک دوسرے کو منسوخ کرتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ ستونوں میں متساوی الاضلاع محرابیں تعمیر کی گئیں۔(۱۳)

اس سفر نامے میں مسجدوں اور کلیساؤں کا ذکر اور تقابل بھی ملتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی ہے۔ تاریخی عمارات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ سفر نامہ نگار ہسپانیہ کی تاریخ میں اتنا کھوئے ہیں کہ ان کی نظر جدید ہسپانیہ کی طرف نہیں جاتی۔ اس سفر نامہ میں تخیل، رومان اور تاریخ کی آمیزش دیکھی جا سکتی ہے۔ سفر نامہ نگار مغرب سے مرعوب یا متاثر بھی نظر نہیں آتے۔

''مغربی جرمنی میں ایکسپریس'' محمد کاظم کا سفر نامہ ہے جو پہلے فنون میں قسط وار شائع ہوا بعد میں کتابی صورت میں سامنے آیا۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۸ء میں ''دامنِ کوہ میں ایک موسم'' کے عنوان سے ہوئی۔ دوسری اشاعت اپنے پہلے

عنوان ''مغربی جرمنی میں ایک برس'' کے پرانے نام ہے یہ سفر نامہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سرد جنگ کے زمانے اور برلن، جرمنی اور یورپ کی سرمایہ دار دنیا اور اشتراکی دنیا میں تقسیم کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ محمد کاظم ایک وظیفے پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے مغربی جرمنی گئے جو سرمایہ دار دنیا کا حصہ تھا۔ جرمنی اور یورپ دوسری عالمی جنگ کے بعد اتحادی فاتح افواج میں تقسیم ہوا۔ یہ سفر نامہ مغربی جرمنی کے بڑے شہروں فرنیکوٹ اور ہائیڈل برگ کے ساتھ ساتھ جرمنی کے دیہات کے تہذیبی نقوش بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔ محمد کاظم جرمنی زبان سیکھنے کے لیے دور دراز کے دیہی علاقوں کی فاضل جرمنی زبان سیکھنے کی غرض سے ''آخن میوہلے'' میں مقیم رہے۔ انھوں نے اس خطے کی تہذیب، ثقافت اور تمدن کو بنظر غور مشاہدہ کیا۔ وہ اس کی خوبیوں کو واضح کرنے میں بہت معروضی رویہ اختیار کرتے ہیں۔

انھوں نے ''من ہائیم، ہائیڈل برگ اور آخن میوہلے'' کے قدرتی حسن، خوبصورتی اور فطرت کے ساتھ ان کے رشتے کا جو مشاہدہ کیا۔ اس میں اپنے قاری کو بھی شامل کیا۔ بہت شگفتہ انداز میں انھوں نے ان شہروں اور قصبوں میں اپنے تجربات کو بیان کیا ہے۔ وہ اس تہذیب یافتہ خطے سے بہت متاثر ہوئے۔ من ہائیم کے حسن اور اس کی ثقافت کے بیان میں یہ رائے دیکھیے:

> دن ڈھلے ہم نے من ہائیم کا قصد کیا۔
>
> نیکر کے بہاؤ کے رُخ ہمارا راستہ بہت پُرفضا اور لبھانے والا تھا۔ (ہولڈرلین)

من ہائیم پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہ لگا۔ جرمن شاعر کی طرح ہم نیکر کی لہروں کے ساتھ ساتھ تو نہیں آئے تھے لیکن فرینکفرٹ سے جنوب کے رخ جانے والی اس آٹوبان کا سفر بھی ہم نو واردوں کے لیے کچھ کم اشتیاق انگیز نہ تھا اور مرسڈیز کی کشادہ کھڑکیوں میں سے ہم سرزمین جرمنی کے تیزی سے گزرتے ہوئے اولین مناظر ایک طالب علمانہ تحیر کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ڈھلانی سطحوں والے ہرے اور بھورے کھیت جن میں کسانوں کی جگہ کہیں کہیں ٹریکٹر اور مشینیں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ سرخ ٹائل کی ڈھلواں چھتوں والی آبادیاں اور ان سے ہٹ کر پرے ہلکا بے رنگ دھواں ہوا میں بکھیرتی ہوئی کسی کارخانے کی چمنی اور دور اُفق پر ابھرتی ہوئی پہاڑیاں اور ان پر چھائے ہوئے گھنے جنگلات، جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے منظر پر نمودار ہوتے اور پھر گم ہو جاتے۔ (۱۴)

آصف فرخی کا ''شہرِ علامات'' منقسم برلن کا ایسا سفر نامہ ہے جہاں سفر نامہ نگار نے کافی وقت گزارا ہے اور تقسیم شدہ برلن اور جرمنی کے دکھ اور کرب کو اس شہر اور ملک کے اندر سے نمایاں ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ وہ بھی ایک وظیفے پر جرمنی زبان سیکھنے برلن گئے اور جرمنی کا تہذیب، تاریخ، ثقافت، روایات اور تمدن کا گہرا مشاہدہ کیا۔ خاص طور پر ان خاندانوں کے آپ کا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد تقسیم کر دیئے گئے، ایک بہ تما دیوار لوگوں کے درمیان ابھری جو اس شہر، ملک اور یورپ کے درمیان نہ صرف زمینی فاصلوں کا سبب بن گئی بلکہ اس نے ان کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی فاصلے ان اقتصادی نظاروں کی وجہ

سے بھی پیدا کئے جو منقسم شہر اور ملک کے دونوں اطراف میں مسلط کئے گئے۔

ایک طرف امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا سرمایہ دارانہ نظام اور دوسری طرف روس کا اشتراکی نظام، دیوارہ دونوں طرف رہنے والوں سے کسی نے نہ پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اس سفر نامے میں ہمیں جرمنی اور یورپ کی یہی منقسم روح پھرتی نظر آتی ہے۔

''برلن کے شہریوں جتنی آزادی تو چڑیا گھر کے چیتے کو بھی حاصل ہے کہ وہ سلاخوں کے پیچھے قید نہیں ہے۔ اس کے لیے جنگل کا سا سماں پیدا کیا گیا ہے۔ چٹانیں اور تالاب بنائے گئے ہیں۔ آرام دہ مصنوعی کچھار بنائی گئی ہے۔ وہ جب تک ان حدود کے اندر رہنا چاہے، آزاد ہے اور اس سے گزرنا چاہے تو چاروں طرف خندق ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ برلن کے چاروں طرف خندق کے بجائے دیوار ہے۔''(۱۵)

اس سفر نامے میں مغربی برلن، مغربی جرمنی اور مغربی یورپ کی ثقافت، سیاست کے علاوہ یہاں کی ثقافتی اور ادبی زندگی کے مظاہر بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔

''اس کیفے کو ایک عورت اور مرد چلاتے ہیں۔ خود ہی اس کا سارا انتظام سنبھالتے ہیں۔ یعنی منیجر بھی خود ہیں اور ویٹر بھی۔ اس میں ہر منگل کو کوئی نہ کوئی ادیب بلایا جاتا ہے۔ اپنی تازہ تحریر سے پڑھتا ہے، اس کے بعد گفتگو ہوتی ہے۔ مہینے بھر کا چھپا ہوا پیشگی پروگرام ہر میز پر مینو کارڈ کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ آج پیڑا شنائڈر کی باری تھی۔ میں اس لیے اور بھی چلا گیا کہ میں برلن پر اس کے ناول سے واقف تھا۔''(۱۶)

''نئی دنیا پرانی دنیا'' اور ''گھومتا پہیہ'' ش۔فرخ کے دو ایسے سفر نامے ہیں جن میں پہلے سفر نامے میں برطانیہ اور امریکہ کے سیر وسفر اور مشاہدے کی بازیافت ہے جبکہ دوسرے سفر نامے میں امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ ہالینڈ، جرمنی، لگبرگ وغیرہ کے اسفار کے مشاہدات بھی شامل ہیں۔ دونوں سفر ناموں کی تخلیق کے بیچ اور مغرب کے اسفار کے درمیان زمانی بُعد بھی ہے مگر دونوں بار کے تجربات سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ برطانیہ تہذیب و ثقافت اور تمدن کے جس درجے پر ہے امریکہ بہادر کو ابھی کئی صدیاں لگیں گی کہ اس کے بالمقابل آسکے۔ بات سرمائے اور دولت یا صنعتی ترقی کی نہیں انسانی تہذیب اور ثقافت کی ہے۔ ش۔فرخی کے اندر ایک صحافی کی روح موجود ہے جو چیزوں کو سوال اٹھا کر دیکھتی ہے۔ دوسرے ان کے اندر تانیثی طرز مشاہدہ بھی موجود ہے۔ انھوں نے ان اسفار میں میوزیم، قدیم عمارتیں، گرجے شہروں کی تہذیبی اور اقتصادی ترقی کی علامات کو گہری نظر سے دیکھا ہے اور اپنے قاری کو تجرباتی انداز اور فکشن کے اسلوب میں دکھایا ہے۔ ان سفر ناموں بالخصوص گھومتا پہیہ کی ایک ادبی قدر یہ ہے کہ وہ بھی خود یورپی لکھاریوں کو متون کی تشکیل نو کرتے ہوئے اپنے متن میں اس طرح شامل

کرتی ہیں کہ مغرب کی روح ان کے اندر بولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے پر بین المتونیت کی ہی ایک شکل ہے۔

''بنیڈ پر جنگ کی مقبول دھن (Heart of OAK) بج رہی تھی۔ کچھ توپیں چلیں، کوندتی ہوئی روشنیاں جلیں اور بجھیں۔ بارود کی بُو آتی، پانی پر بحری جہاز کی حرکت سے پیدا ہونے والی چھل چھل سنائی دی۔ یہ منظر ٹرافلگر کی جنگ کا تھا۔ یہ جنگ ایڈمرل نیلسن نے فرانس کے خلاف لڑی تھی۔ نیلسن کندھے پر گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔

نیلسن مر رہا تھا۔ اس کا سانس اُکھڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھی اس پر جھکے ہوئے تھے۔ پس منظر میں گرجے کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ ان گھنٹیوں میں فتح کی خوشی اور جنگ میں مارے جانے والوں کے غم کا ملا جلا تاثر تھا۔ نیلسن جب آخری سانس لے رہا تھا تو اسے فتح کی خبر ملی، نیلسن جس نے کہا تھا: برطانیہ ہر شخص سے ادائے قرض کی توقع رکھتا ہے۔

عجائب گھر کا یہ راستہ باہر کو جاتا ہے۔ میں نے مادام ٹساڈز کی سوونیئر شاپ سے کچھ تحائف خریدے اور کافی کی طلب میں عجائب گھر سے باہر نکل آئی۔ اس وقت چارلس ڈکنز کے الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ انھوں نے مادام ٹساڈ کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ ایک نمائش ہی نہیں بلکہ ایک مکتبِ فکر ہے۔(۱۷)

''اچانک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہم گھوم رہے ہیں یا زمین گھوم رہی ہے۔ کھڑکی سے باہر خلیج کے نیلے پانی میں تیرتی ہوئی کشتیاں اور مرغابیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ پہلے ہمیں ایک بڑے سے پُل کا آدھا حصہ نظر آ رہا تھا۔ پھر پورا نظر آنے لگا۔ اب وہ آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اب ہمیں کھڑکی سے باہر صرف ملک بوس عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد پُل ایک بار پھر دکھائی دینے لگا۔(۱۸)

''سوویت اس بارے میں غیر یقینی طور پر سخت تھے۔ میں نے ایندروپوف سے کہا میرا ایک سوال ہے اگر موسکفا دریا کے ساتھ ساتھ ایک دیوار بنی ہو۔ تمہاری ماں دیوار کے اس طرف رہتی ہو، جبکہ تم تمہارے بھائی اور تمہاری بہنیں دوسری جانب ہوں اور اگر بچے اپنی ماں سے بلا روک ٹوک ملنا چاہتے ہوں تو کیا یہ جنگ آمیزی ہو گی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف یہ کہا کہ جرمنی کی تقسیم تاریخ کا فیصلہ تھا۔ اسے پھر سے چھیڑنا امن کو خطرے میں ڈالنا ہو گا۔''(۱۹)

اب جو کچھ میرے سامنے تھا وہ بے یقینی طور پر سحر انگیز تھا۔ ورج کی پھیکی پڑتی ہوئی روشنی جب ڈیوک روالف پل پر گرنے لگی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے قوس قزح زمین پر اتر آئی ہو۔ سرخی مائل سنہری کرنوں کی لکیریں قدرتی نباتات کی ہریالی میں گھلتی ہوئیں۔ کہیں کہیں زرد پھریرے پتھر کے قدرتی رنگوں کو نیا انگ دے رہے تھے۔ پل کے اس پار، گھنے پیڑوں کے جھنڈ میں سے جھانکتے ہوئے سلیٹی ڈھلوانی چھتوں والے سفید سفید گھر۔ پورے ماحول میں ایک خواب آلود، پر اسرار سکون رچا ہوا تھا۔ ایک جادو نگری تھی جس کے فسوں کو توڑنے کے لیے وہاں کسی پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ تک نہ تھی۔ دائیں طرف نشیب میں پرانے شہر کی عمارتوں کا منظر۔ وہیں کہیں مچھلی منڈی تھی۔ جنگلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے، کبھی ماند پڑتی ہوئی روشنی میں کلیسا کی صلیب کو کیمرے سے فوکس کرتے ہوئے اور کبھی سارے کے سارے منظر کو فطرت کی دلآویزی کو

اپنے اندر تک اتارنے کے لیے میں خاصی دیر تک مبہوت کھڑی رہی۔(۲۰)

رنگ برنگے شہر سید گلزار حسنین کا یورپ کا سفر نامہ ہے جس میں آسٹریا، جرمنی، سوئٹزلینڈ اور فرانس کے اسفار کے دل آویز مرقعے موجود ہیں، وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور سیاحت سے فطری دلچسپی انھیں یورپ لے گئی۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے ان ممالک اور شہروں کی روح کے خارجی اور داخلی دونوں رخ دیکھے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا انداز بیان شگفتگی کا حال ہے۔ انھوں نے یورپ یا مغرب کی ثقافت، تہذیب، تمدن کے ساتھ ساتھ برق رفتار ترقی اور تیز تر زندگی کا مشاہدہ اپنے مخصوص اسلوب میں اپنے قاری کے سامنے رکھا ہے، ویا تا کی تاریخ ترک مسلمانوں اور یورپ کے درمیان ایک طویل محاورے کی تاریخ ہے، یہ تاریخ بھی ایک طرف سے یورپ کی آزادی اور ترقی کا پس منظر ہمیں سمجھاتی ہے۔ ان کے ہاں اور سفر نامہ نگاروں کی طرح پاکستانی تارکین وطن اور یورپ کی سیر کرنے والے پاکستانیوں کی مخصوص افتادِ طبع اور نفسیاتی وضع کا مشاہدہ بھی موجود ہے۔

''عمارت سبزے کی آغوش میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ خوش رنگ پھولوں کے تختے سبز لان میں ہنستے مسکراتے جزیرے دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم گول اور چوکور تالابوں میں سائے پانی کے ساتھ ہم رقص لگے۔ ان کے درمیان اور کناروں پر بنے حقیقت کا گھونگھٹ اوڑھے ہوئے مجسمے جو اکثر ان تالابوں میں پانی اُگل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے حقیقت اور وہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ یہ محل ۱۶۰۶ء میں بنایا گیا جو گاہے بگاہے تعمیر و ترقی کی منازل سے گزرا، ۱۸۱۸ء میں اسے آگ لگ گئی اور پھر بعد میں موجود ڈیزائن میں بنا۔ اس کے مین ہال کے اندر اوپر جاتی سیڑھیوں کو کندھوں پر اٹھائے مجسموں اور سیڑھیوں کی ریلنگ کو کتنے ذہنوں نے سوچا ہوگا! پھر لاتعداد ہاتھ جان توڑ محنت سے معمار کے تخیل کو وجود میں لائے ہوں گے۔''(۲۱)

''سوئٹزلینڈ میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں قدرت نے اپنے چہرے سے تمام نقاب الٹ دیے ہیں اور اپنی رعنائیاں اور لطافتیں پوری طرح ظاہر کر دی ہیں۔ قدرتی فیاضی کی قدر لوگوں نے بھی خوب کی ہے اور اپنی محنت اور سلیقے سے اس حسن کو لازوال بنا دیا ہے۔ جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے، وہ مختلف وادیوں کو ایک خاص بلندی سے عبور کر رہی تھی، کسی جگہ سڑک نیچے وادی کے درمیان سے بھی گزرتی۔ اس علاقے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت بڑے سائز کا انتہائی خوبصورت کیلنڈر ہو اور ہم ایک چیونٹی کے مانند اس پر سفر کر رہے ہوں۔ گھڑی دیکھی تو شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ دھوپ پہاڑوں سے اترنے لگی تھی اور سایے بڑھتے ہوئے کوہساروں کی چوٹیوں سے چند ہاتھ نیچے رہ گئے تھے۔ کار ایک چھوٹے سے گاؤں کے بازار سے گزر کر دائیں جانب مڑی تو سامنے دور چوٹی پر ایک قلعہ مام محل کی عمارت اور اس کے قدموں میں بنے مزارعین کے چھوٹے چھوٹے گھر رخصت ہوتی دھوپ میں نہائے ہوئے تھے۔ بادلوں کے چند ٹکڑے نیچے وادی کے اوپر بڑے آرام سے معلق تھے۔ ہر سمت سبزہ، دیودار کے گھنے جنگل کہیں کہیں خوبصورت گھر، آوارہ چرتی گائیں اور بل کھاتی

سڑک، لگا جیسے کسی شریر بچے نے ایک خوبصورت تصویر پر سیاہ پنسل سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ میرے خیال میں یہ ملک قدرت کی شاہکار پینٹنگ ہے۔ اس شاہکار کی منظر کشی الفاظ میں ممکن نہیں۔ خدا کی اس حسین بھول بھلیاں میں عقل جکڑی جاتی ہے۔''(۲۲)

''ذوق دشت نوردی'' ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف کے برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے سفری مشاہدات کی کتھا ہے۔ انھوں نے ان خطوں کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور تمدن کی روح کو دریافت کیا ہے۔ وہ امریکہ کی برق رفتار اقتصادی ترقی سے متاثر نہیں ہو سکے اس لیے امریکہ کو وہ ایک نیا ساہوکار اور نئی نو آبادکار قوت قرار دیتے ہیں۔ برطانیہ کی تہذیبی زندگی انھیں امریکہ کی نسبت گہری اور قابل قدر نظر آتی ہے۔ ان کے یونان اور مشرقی یورپ کے اسفار کی روداد بھی ان ممالک کی تہذیبی اور ثقافتی روح کے ساتھ ساتھ جدید دور کے کچھ اہم سوالوں کے ساتھ بہت دلچسپ نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں یورپ کی جدید اور قدیم زندگی کے مظاہر کا تقابل بھی نظر آتا ہے اور یہ بڑا سوال بھی کہ کیا عالمگیریت کے طوفان سے یونان اور مشرقی یورپ کے لوگ اپنی ثقافتی زندگی کو بچا پائیں گے یا نہیں۔

''دیونی سس کا تھیٹر دیکھنے کے بعد ہم ایکروپولس کی طرف لپکے، کیوں کہ وقت ختم ہونے والا تھا۔ ۶۰۰ یونانی فی کس ٹکٹ تھا۔ یعنی تقریباً ۴ ڈالر۔ بچوں کا کوئی ٹکٹ نہ تھا۔ ٹکٹ لیے اور ایکروپولس کے اندر داخل ہوئے۔ سب سے پہلے عظیم الشان گزرگاہ ہے جسے ''پروپائی لا'' (Propy Laea) کہتے ہیں۔ یہ یادگار دروازہ ۴۳۷ اور ۴۳۲ قبل مسیح کے درمیان تعمیر کیا گیا۔ اسے عظیم معمار مینسیکلیز کے تخیل نے ابھارا اور انہی ہنرمند ہاتھوں نے بنایا۔ جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے یہ کبھی مکمل تو نہ ہو سکا، تاہم اپنی موجودہ حالت میں بھی ایک عظیم یادگار سے کم نہیں۔ اس کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا، لیکن نہایت شان دار مندر ہے۔ یہ دیوی ایتھنا نائنک (Ethna Nike) کا مندر ہے، جسے (Wingless Victory) کا نام دیا جاتا ہے۔ اسے پانچویں صدی قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ یونانیوں کی ایرانیوں پر فتح کی خوشی میں بنایا گیا تھا۔ یونانیوں نے اسے 'بے پر کی فتح'' کا نام اس لیے دیا تھا کہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ دیوی اب ایتھنز سے اُڑے گی نہیں، یعنی فتح اہل ایتھنز کے مقدر میں ہوگی۔''(۲۳)

''پھر اُس نے ایک دانش ور کی طرح بولنا شروع کیا۔ اس کے مطابق ۱۹۸۵ء ہی سے ہنگری کے لوگوں نے جمہوری آزادی مانگنی شروع کر دی تھی جس کی تکمیل ۱۹۸۹ء میں ہوئی لیکن دونوں نظاموں میں فرق یہ ہے کہ پہلے بے روزگار بالکل نہ تھی۔ تنخواہیں کم ہونے کے باوجود ہر شخص کو روزگار مہیا تھا۔ حکومت کا کنٹرول سخت تھا۔ اس لیے بدعملی، بدنظمی اور کرپشن نہ تھی۔ لوگ قانون کا احترام کرتے تھے اور قانون کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ نظام ٹوٹ گیا تو لوگوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا لیکن اب لوگ مادر پدر آزاد ہو گئے۔ کرپشن حد سے بڑھ گئی ہے۔ بے روزگاری انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ امیر، امیر تر اور غریب غریب تر ہو گئے ہیں۔ غربت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ نوخیز لڑکیاں چند ڈالروں کے عوض جسم بیچتی پھرتی ہیں۔ ایک مخصوص

علاقے میں ہر ۵۰۰ گز کے فاصلے پر نوجوان لڑکیاں ملیں گی۔ اُن میں سے کچھ تو خود یہ کاروبار کرتی ہیں اور کچھ مافیا کی چھوڑی ہوئی ہیں۔ یہ زیادہ فیشن ایبل، خوبصورت اور برتر سٹیٹس کی ہوتی ہیں۔ وہ آپ کو اپنے ٹھکانے پر لے جاتی ہیں اور پھر انسان لُٹ لُٹا کر ہی واپس آتا ہے۔ چوری چکاری عام ہے اور جرائم روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں جب کہ سوشلسٹ نظام میں جرائم کا نام ونشان نہیں تھا۔(۲۴)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو سفر نامے میں مغرب کی پیشکش مثبت نظر آتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی سفر نامہ نگار مغرب سے مرعوب ہو کر احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں اور مغرب کی چکا چوندان کی بصارت کو متاثر کرتی ہے مگر جلد ہی وہ مغرب کے کچھ منفی پہلوؤں پر بھی نظر کرتے ہیں۔ زیادہ تر مغرب کو مثبت، روشن خیال، علم دوست، انصاف پسند خطے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

حواشی:

(۱) مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، (لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۴
(۲) یوسف کمبل پوش، عجائبات فرنگ، مرتبہ تحسین فراقی، (لاہور: مطبع اللہ والا پرنٹرز، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۰۶
(۳) ایضاً، ص ۱۰۸
(۴) ایضاً، ص ۱۰۴
(۵) سر سید احمد خان، مسافران لندن، مرتب اصغر عباس، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۱۲
(۶) ایضاً، ص ۱۴۸
(۷) ابنِ انشا، آوارہ گرد کی ڈائری، (دہلی: کتاب والا، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۶
(۸) اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، (لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۶ء)، ص ۴۱
(۹) ایضاً، ص ۱۴۲
(۱۰) قرۃ العین حیدر، جہانِ دیگر، (لاہور: منظور پریس، سن ندارد)، ص ۲۹
(۱۱) ایضاً، ص ۱۳۲
(۱۲) مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، (لاہور: التحریر، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۰
(۱۳) ایضاً، ص ۳۲۴
(۱۴) محمد کاظم، مغربی جرمنی میں ایک برس، (سفر نامہ)، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۱۔ ۵۲
(۱۵) آصف فرخی، شہرِ علامات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۷۹
(۱۶) ایضاً، ص ۱۱۵۔ ۱۱۶
(۱۷) ش۔ فرخ، نئی دنیا پرانی دنیا، (کراچی: غالب کتاب گھر، ۱۹۷۹ء)، ص ۵۳

(۱۸) ایضاً،ص ۱۲۴
(۱۹) ش۔فرخ، گھومتا پہیہ، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۵ء)،ص ۱۸۴
(۲۰) ایضاً،ص ۲۰۳۔ ۲۰۴
(۲۱) سید گلزار حسین، رنگ برنگے شہر، (لاہور: سانجھ، ۲۰۱۵ء)،ص ۲۷
(۲۲) ایضاً،ص ۱۹۷
(۲۳) ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف، ذوقِ دشت نوردی، (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز،س۔ن)،ص ۸۵
(۲۴) ایضاً، ہوسِ سیر و تماشا، ایضاً،ص ۴۴۔ ۴۵

مآخذ:

(۱) اشرف، اے۔ بی۔، ڈاکٹر، ذوقِ دشت نوردی، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز،سن ندارد
(۲) _____، ہوسِ سیر و تماشا، _____،ص ۴۴۔ ۴۵
(۳) انشا، ابنِ، آوارہ گرد کی ڈائری، دہلی: کتاب والا، ۲۰۰۸ء
(۴) بیگ، مرزا حامد، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۲۰۱۴ء
(۵) تارڑ، مستنصر حسین، اندلس میں اجنبی، لاہور: التحریر، ۱۹۸۰ء
(۶) حسین، گلزار، سید، رنگ برنگے شہر، لاہور: سانجھ، ۲۰۱۵ء
(۷) حیدر قرۃ العین، جہانِ دیگر، لاہور: منظور پریس، سن ندارد
(۸) خان، سید احمد، سر، مسافران لندن، مرتب اصغر عباس، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۹ء
(۹) ریاض الدین، اختر، دھنک پر قدم، لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۶ء
(۱۰) کاظم، محمد، مغربی جرمنی میں ایک برس، (سفرنامہ)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
(۱۱) فرخ، ش، نئی دنیا پرانی دنیا، کراچی: غالب کتاب گھر، ۱۹۷۹ء
(۱۲) _____، گھومتا پہیہ، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۵ء
(۱۳) فرخی، آصف، شہرِ علامات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
(۱۴) کمبل پوش، یوسف، عجائبات فرنگ، مرتبہ تحسین فراقی، لاہور: مطبع اللہ والا پرنٹرز، ۱۹۸۴ء